پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم ★

# "زندہ رود"

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں شعرا کی روایت کی طرح کوئی تخلص یا شاعرانہ نام استعمال نہیں کیا۔ اردو اور فارسی غزلیات میں کہیں اپنا نام "اقبال" لکھا ہے۔ فارسی مثنویات میں سے اسرار خودی، رموز بیخودی، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، مسافر، گلشن راز جدید اور بندگی نامہ میں انہوں نے کہیں اپنا نام یا کوئی دوسرا عنوان استعمال نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والی مثنوی "جاوید نامہ" میں انہوں نے اپنے آپ کو "زندہ رود" کے عنوان سے متعارف کرایا ہے اور اس تمام کتاب میں وہ اسی نام سے پکارے گئے ہیں۔

جاوید نامہ آسمانی سیاحت پر مبنی کتاب ہے جس میں اقبال مولانا جلال الدین رومیؒ کی رہبری اور رہنمائی میں ایک دوسری دنیا کی سیر کرتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

آنچہ گفتم از جہان دیگر است  این کتاب از آسمان دیگر است(۱)

مولانا رومی کے ہمراہ اقبال فلک قمر کی سیاحت کے بعد فلک عطارد میں پہنچتے ہیں۔ یہاں سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا نماز کی حالت میں دکھائی دیتے ہیں۔ نماز میں افغانی امام اور حلیم پاشا مقتدی ہیں۔ ان کے ساتھ رومی اور اقبال بھی نماز میں شریک ہوجاتے ہیں۔ افغانی نماز مین سورۃ "والنجم" کی تلاوت کرتے ہیں جس کی تاثیر سے اقبال کے ضمیر پر قرآن مجید کے اسرار کھل جاتے ہیں۔ اقبال نماز کے بعد اٹھتے ہیں اور جمال الدین افغانی کی دست بوسی کرتے ہیں۔ رومی اقبال کو افغانی کے حضور متعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ شخص بظاہر ایک ذرہ سا ہے لیکن آسمانوں کی سیاحت کا شوق رکھتا ہے۔ اس کے دل میں سوز و درد کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ وہ صرف اپنے آپ پر نظر رکھتا ہے اور اپنے آپ کو کسی دوسرے کے سپرد نہیں کرتا۔ آزاد منش ہے اور کائنات کی وسعتوں میں تیزی سے قدم رکھتا ہے۔ میں اسے شوخی سے "زندہ رود" کہتا ہوں:

گفت رومی : ذرۂ گردوں نورد  در دل او یک جہان سوز و درد
چشم جز بر خویشتن نکشادۂ  دل بکس ناداده آزادۂ
تند سیر اندر فراخائے وجود  من ز شوخی گویم او را "زندہ رود"(۲)

★ سابق صدر شعبہ فارسی وڈین کلیہ علوم اسلامیہ والسنہ شرقیہ

چنانچہ افغانی اقبال کو "زندہ رود" کے نام سے پکارتے ہوئے کہتے ہیں:

زندہ رود! از خاکدان ما بگوئے　　از زمین و آسمان ما بگوئے[۳]

اس کے بعد اقبال خود بھی جہاں کسی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں زندہ رود کے عنوان سے ہی کرتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے جب اپنے تمام کلام میں اقبال کے علاوہ کوئی نام یا تخلص استعمال نہیں کیا تو جاوید نامہ میں وہ ایک نئے نام "زندہ رود" سے متعارف ہونے پر کیوں مجبور ہوئے۔

در اصل جاوید نامہ ایک ایسی دنیا کے مناظر پیش کرتا ہے جس میں تمام کردار وہ ہیں جو وفات پا چکے ہیں اور عالم ارواح میں ہیں، منجملہ مولانا جلال الدین رومی، سید جمال الدین افغانی، سعید حلیم پاشا، مہدی سوڈانی، کچنر، فرعون، طاہرہ، مرزا غالب، منصور حلاج، سید علی ہمدانی، غنی کشمیری، جعفر از بنگال، صادق از دکن، سلطان ٹیپو شہید، ناصر خسرو، ابو جہل اور نطشے وغیرہ۔ یہ سب افراد وہ ہیں جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے اقبال عالم ارواح میں بحیثیت ایک زندہ فرد نہیں جاسکتے تھے اور فوت شدہ لوگوں سے گفتگو نہیں کرسکتے تھے، اور اگر وہ ایسا کرتے تو فنی نقطہ نظر سے یہ ان کی غلطی ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے نہایت تدبر کے ساتھ اپنی روحانی یا فکری شخصیت کا نام "زندہ رود" رکھا۔

اطالوی مصنف دانتے نے اپنی مشہور کتاب "طربیہ خداوندی" میں جو اس کی آسمانی سیاحت پر مبنی ہے یہ غلطی کی کہ اپنی فکری شخصیت کے لئے کوئی دوسرا نام منتخب نہیں کیا بلکہ ورجل کی رہنمائی میں خود دانتے نے دوزخ، اعراف اور بہشت کی سیر کی۔[۴] یہ غلطی اس سے خصوصاً اس بنا پر سرزد ہوئی کہ اس نے "طربیہ خداوندی" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج سے متاثر ہو کر تصنیف کی اور اس نے متعدد مناظر معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق روایات سے اخذ کئے۔[۵] سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج خیالی یا روحانی نہ تھا، بلکہ جسمانی ذات کے ساتھ تھا۔ جسمانی ہونے کی وجہ سے ہی کفار مکہ نے اس کا انکار کیا تھا۔ دانتے اس نکتہ کو درک نہ کرسکا۔ چنانچہ اس نے اپنی خیالی سیاحت کے دوران اپنے لئے کوئی خیالی نام منتخب نہ کیا۔ جو غلطی دانتے نے کی وہی غلطی اس سے پہلے ایک زرتشتی مصنف ویراف نے کی، جو پندار نیک، گفتار نیک اور کردار نیک کے نام پر شراب کے تین پیالے پی کر سو گیا اور سات دن تک دوزخ، اعراف اور بہشت کی سیاحت کرتا رہا۔[۶]

جاوید نامہ میں اقبال کا اپنے لئے انتخاب کردہ نام "زندہ رود" کئی لحاظ سے موزوں اور پر معنی ہے۔ یہ نام اقبال کی محض ذہنی اختراع نہیں، بلکہ فارسی ادب میں بہت پہلے سے موجود رہا ہے "زندہ رود" اصفہان کے مشہور دریا کا نام

ہے۔ اصل نام "زاینده رود" ہے۔ چونکہ یہ اپنے ہی چشموں کے پانی سے دریا بنتا ہے اور کسی دوسری ندی پانی مستعار نہیں لیتا، لہذا اسے "زاینده رود" کہتے ہیں۔ زاینده بمعنی خود پیدا کرنے والا اور بمعنی ماں۔[۷] معلوم ہوتا ہے لفظ زاینده رود کثرت استعمال کی وجہ سے مخفف ہو کر زنده رود ہو گیا جو مختصر بھی ہے اور پر معنی بھی۔ مرات البلدان کا مصنف لکھتا ہے اسے زنده رود اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا پانی ضائع نہیں ہوتا اور سب کا سب زراعت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔[۸] آبپاشی کے لحاظ سے یہ ایران کا سب سے اہم دریا ہے۔[۹]

زاینده رود یا زنده رود ایک ندی کی شکل میں لرستان کے پہاڑی سلسلے زرد کوہ کے مشرقی دامن سے نکلتا ہے۔ یہاں مشہور بختیاری قبیلہ آباد ہے۔ یہ دریا فیروزان، اصفہان اور یزد کی زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔ آخر میں اس کا پانی سات حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے جنہیں نہروں کی شکل دی گئی ہے۔ جو نہریں زنده رود سے نکلتی ہیں انہیں "مادی" کہاجاتا ہے۔ زاینده رود/زنده رود پر متعدد پل ہیں۔ شہر اصفہان میں پل اللہ وردی خان یا پل سی وسہ چشمہ مشہور ہے۔ ایک پل کا نام پل خواجو ہے۔ یہ پل صفوی دور میں بنائے گئے جو ابھی تک قائم ہیں۔ دریا کا پانی گاوخونی کے مقام پر زمین میں جذب ہو کر ختم ہوجاتا ہے۔ زنده رود تقریباً چار سو کلومیٹر لمبا دریا ہے۔ زاینده رود/زنده رود سے کچھ فاصلے پر "آب کرند" نام کا ایک عظیم چشمہ بھی ہے جو آج کل آب کوہ رنگ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بھی ایک دریا کی شکل اختیار کرتا ہے۔ بعض ایرانی بادشاہوں نے متعدد بار یہ کوشش کی کہ "آب کوہ رنگ" کو زنده رود سے ملادیاجائے مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ سب سے پہلے شاہ طہماسپ صفوی نے یہ کام شروع کیا جو بعد میں بھی جاری رہ لیکن یہ دونوں دھارے آپس میں نہ مل سکے۔[۱۰]

خاقانی شروانی زنده رود کو دریائے نیل سے بڑا تصور کرتا ہے:

نیل کم از زنده رود و مصر کم ازجی
قاہره مقصور پادشای صفاہان

نظامی گنجوی زنده رود سے زندگی کا مفہوم اخذ کرتا ہے:

ز خیزان طرف تا لب زنده رود
زمین زنده گشت از نوای سرود

حافظ شیرازی زنده رود کو آب حیات قرار دیتا ہے:

اگرچہ زنده رود آب حیات است

ولی شیر از ما از اصفہان بہ[11]

زندہ رود نام کی ایک کتاب خسرو پرویز کے دور سلطنت یعنی ۵۹۰ تا ۶۲۸ء میں زندہ ازرم نامی ایک زرتشتی دانشور نے تصنیف کی۔ یہ شخص اصفہان کا رہنے والا تھا۔

اس کتاب کا موضوع روان پایندہ یعنی روح جاوداں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایرانی دانشوروں کے اقوال جمع کئے گئے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ فرہنگ آنند راج کے مصنف کے پاس فرہنگ کی تصنیف یعنی ۱۲۰۷ھ تک موجود تھا۔ (۱۲) رسالہ "آذر کیوان و پیروان" کے مطابق یہ کتاب بمبئ کے مطبع دور بین سے شائع ہوئی۔ (۱۳)

چونکہ زندہ ازرم اصفہان کا رہنے والا تھا اور زندہ رود اس کے شہر اصفہان کا عظیم دریا تھا لہذا معلوم ہوتا ہے مصنف نے اپنی کتاب کو اسی مناسبت سے زندہ رود کے نام سے موسوم کیا۔ یہ نام مذکورہ کتاب کے موضوع یعنی روان پایندہ سے بھی خاص مطابقت رکھتا ہے۔

زندہ رود نام کی دوسری کتاب ڈاکٹر جاوید اقبال کی تصنیف ہے جو انہوں نے علامہ اقبال کے احوال و افکار پر جامع صورت میں تصنیف کی۔ "زندہ رود" کا فارسی ترجمہ چار جلدوں میں خانم دکتر شہیندخت کامران مقدم نے "جاویدان اقبال" کے نام سے کیا۔

زندہ رود کے بارے میں اس سے پیشتر جو عبارات درج کی گئی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ:

۱۔ زندہ رود ایک دریائے رواں ہے۔

۲۔ یہ دریا اپنے ہی چشموں کے پانی سے اپنا وجود بناتا ہے اور کسی دریا یا ندی سے پانی مستعار نہیں لیتا۔

۳۔ اس کا تمام پانی حیات انسانی کے کام آتا ہے۔

۴۔ کسی سمندر یا دوسرے دریا میں نہیں گرتا، بلکہ صحراؤں کو سرسبز کرتا ہوا زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔

"زندہ رود" کی مندرجہ بالا صفات و مشخصات کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اقبال کی فکری شخصیت کو متعارف کرانے کے لئے اس سے زیادہ واضح اور جامع استعارہ ان کے کلام میں نہیں ملتا۔ زندہ رود ان کے فکر و نظر کا بہترین مظہر اور معرف ہے۔ اس بنا پر علامہ نے اسے اپنے نام کے طور پر منتخب کیا۔

ذیل میں زندہ رود کی مذکورہ چار صفات کو ان کے آئینہ کلام میں دیکھنے کی ایک مختصر کوشش کی جاتی ہے۔

۱۔ زندہ رود ایک دریائے رواں ہے۔

اقبال نے اپنے کلام میں اکثر مقامات پر زندگی کو جوئے رواں اور دریائے رواں سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود (۱۴)

یعنی زندگی ایک جوئے رواں ہے جو ہمیشہ رواں رہے گی۔ یہ پرانی شراب جواں ہے اور ہمیشہ جواں رہے گی۔

"جوئے آب" کے نام سے ان کے کلام میں ایک دل انگیز نظم ہے جو گوئٹے کی مشہور نظم "نغمہ محمد ﷺ" کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔(۱۵) اس نظم کے دو آخری بند یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں نبی کریم علیہ السلام کی حیات پاک کا بیان ہے:

صد جوئے رشت و مرغ و کہستان و باغ و راغ — گفتند: "اے بسیط زمیں با تو سازگار
مارا کہ راہ از تنگ آبی نبردہ ایم — از دستبرد ریگ بیاباں نگاہ دار"
واکردہ سینہ را بہ ہوا ہای شرق و غرب — در بر گرفتہ ہمسفران زبون و زار

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ میرود
باصد ہزار گوہر یکدانہ میرود

دریائے پر خروش ز بند و شکن گذشت — از تنگنائے وادی و کوہ و دامن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را — از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار — در ہرزماں بتازہ رسید، از کہن گذشت

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود (۱۶)

مندرجہ بالا اشعار میں اسلامی تخیل کو نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی زندگی کے حوالے سے آغاز میں "جوئے آب" سے موسوم کیا گیا اور جب وہ اپنی آفاقی رحمتوں سے کائنات پر محیط ہو گئی تو اقبال نے اسے دوسرے بند میں "دریائے پر خروش" سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال نبی علیہ اسلام کو ایک ایسا سمندر قرار دیتے ہیں جس کی موجیں بلند ہیں:

مصطفیٰ دریاست، موج او بلند

مذکورہ نظم میں اللہ تعالیٰ کو "بحر بیکرانہ" کہا۔ اسی طرح ذات باری تعالیٰ کو ایک شعر میں "محیط بیکراں" سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو ہے محیط بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر[۱۷]

جس طرح مذکورہ بالا شعر میں اقبال اپنی خودی کو حق تعالیٰ کی طرح وسیع دیکھنا چاہتے ہیں وہ دوسروں کو بھی وسعت پذیری کی تعلیم دیتے ہیں۔ "سلطان ٹیپو کی وصیت" کے حوالے سے ان کا یہ شعر ایک عظیم درس حیات ہے:

اے جوئے آب! بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول[۱۸]

اقبال جوش و حرکت کے شاعر ہیں اور یہ پانی کی نمایاں خاصیت ہے۔ وہ اظہار خودی کےلئے استعارے کو طرح طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:

کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر مقام اپنی خودی کا فاش تر کر[۱۹]

پانی کا استعارہ اقبال کے لئے یوں بھی معنی خیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: "**وکان عرشہ علی الماء**"[۲۰] یعنی اس کا عرش پانی پر تھا اور شاید یہ اسی تجلی ربانی کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زندہ چیز کو پانی سے تخلیق فرمایا، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

"**وجعلنا من الماء کل شئ حی**"[۲۱]

پانی طبعی طور پر زندگی اور سرچشمہ زندگی ہے اور اقبال اس کی ہر کیفیت اور ہر نظارے سے محظوظ ہوتے ہیں اور اس سے گوہر معانی حاصل کرتے ہیں۔ دریائے راوی پر ان کی ایک نظم "کنارہ راوی" کے نام سے ہے جو یوں شروع ہوتی ہے:

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی[۲۲]

اسی طرح ان کی نظم ہے "ایک شام" دریائے نیکر (ہائیڈ برگ) کے کنارے۔ ایک نظم "موج دریا" کے عنوان سے ہے جس میں علامہ نے اپنی ہستی کو موج سے تعبیر کیا ہے:

موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے
ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے[۲۳]

اسی طرح ایک قطعہ "فوارہ" کے نام سے ہے جس میں اسے زور دروں کا نتیجہ قرار دیا ہے:

"بلند زور دروں سے ہوا ہے فوارہ"(۲۴)

چشمہ بھی کلام اقبال میں زندگی، بیداری اور حرکت کی علامت ہے:

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے(۲۵)

سیلاب سے بھی اپنے آپ کو تشبیہ دی ہے:

سلیم، مرا بہ جوئے تنک مایہ پیچ
جولان گہے بوادی و کوہ و کمر بدہ(۲۶)

کلام اقبال میں دریاؤں میں زندہ رود، دریائے راوی اور دریائے نیکر کے علاوہ دریائے نیل، دریائے دجلہ، دریائے فرات، دریائے جیحوں، دریائے دنیوب، دریائے گنگا، دریائے کاویری اور دریائے وادالکبیر کے نام علامات کے طور پر ملتے ہیں۔ فلک زہرہ میں دریائے زہرہ بھی ایک نام ملتا ہے، جو ظاہر ہے ان کی فکری اختراع ہے۔

دکن میں بہنے والے دریائے کاویری کا مختصر ذکر یہاں ضروری ہے جس کے کنارے سلطان ٹیپو نے داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ سلطان ٹیپو شہید کے عظیم کردار کے حوالے سے اقبال کو دریائے کاویری اتنا عزیز ہے کہ وہ ٹیپو کی زبان سے اسے بھی زندہ رود ہی کا نام دیتے ہیں۔

باہماں سوزے کہ دارد ساز جاں یک دو حرف ازما بہ کاویری رساں
درجہاں تو زندہ رود او زندہ رود خوشترک آید سرود اندر سرود(۲۷)

بعد ازاں اقبال دریائے کاویری کو خطاب کرتے ہوئے زندگی، موت اور شہادت کے حقائق بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دریائے کاویری کی موجوں کا اضطراب ٹیپو شہید کے خون کی گرمی کا نتیجہ ہے۔ سلطان ٹیپو شہید اقبال کے لئے زندگی کی معنی خیز علامت ہے جو طول حیات کی بجائے عرض حیات کو پسند کرتا ہوا کہتا ہے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی بھیڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے:

زاں کہ در عرض حیات آمد ثبات از خدا کم خواستم طول حیات
زندگی را چیست رسم و دین و کیش یک دم شیری بہ از صد سال میش(۲۸)

۲۔ "زندہ رود کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ دریا اپنے ہی چشموں کے پانی سے اپنا وجود بناتا ہے اور کسی

دوسرے دریا یا ندی سے پانی مستعار نہیں لیتا۔ مکتب اقبال کا یہ ایک اہم درس ہے کہ انسان اپنی دنیا آپ پیدا کرے اور زندگی میں کیا بحیثیت فرد اور کیا بحیثیت قوم دوسروں کا احسان مند نہ ہو کیوں کہ زندگی کوشش ہے استحقاق نہیں:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے، ضمیر کن فکاں ہے زندگی[۲۹]

مسافر حیات اپنے تیشہ ہمت سے اپنی راہیں خود تراشے اپنے فکر و نظر میں حدت پیدا کرے اور دوسروں کی محض تقلید نہ کرتا رہے کہ یہ ایک عذاب ہے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است[۳۰]

جو لوگ اپنے وسائل اور اپنے فکر و نظر کے سرچشموں کو مسدود رکھتے ہیں وہ دوسرے افراد یا اقوام کے سامنے دست سوال دراز کرنے لگتے ہیں۔ اقبال اسلامی نظریات کے مطابق سوال کی ہر صورت کو ناپسند کرتے ہیں خواہ اس کا تعلق مادی معاملات سے ہو اور خواہ فکری و معنوی معاملات سے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جس طرح عشق خودی کو مستحکم بناتا ہے سوال خودی کو ضعیف کرتا ہے۔ وہ سب کچھ جو بغیر ذاتی سعی کے حاصل ہو سوال کے ذیل میں آجاتا ہے۔ ایک دولت مند شخص کا بیٹا جسے اپنے باپ کی دولت ورثہ میں ملے، سائل اور گداگر ہے۔ اسی طرح وہ بھی جو دوسروں کے خیالات کے مطابق سوچتا اور خیال کرتا ہو۔ پس خودی کے استحکام کے لئے ہمیں عشق حاصل کرنا چاہیے۔ یعنی وہ عمل جو ہر شے کو مسخر کرلے اور سوال کی ہر صورت سے گریز کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ کم از کم مسلمانوں کے لئے تو عمل کا بہترین درس بہم پہنچاتا ہے۔"[۳۱]

رومی نے کہا تھا:

از علی میراث داری ذوالفقار بازوی شیر خدا ہستت بیار[۳۲]

یعنی حضرت علی کی تلوار تو وراثت میں تمہارے پاس ہے، اگر شیر خدا کا بازو ہو تو دکھاؤ تاکہ تمہیں مانیں۔ اقبال بھی اسی فکر کو خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آن عزم بلند آور، آن سوز جگر آور
شمشیر پدر خواہی بازوئے پدر آور

باپ کی وراثت پر زندگی بسر کرنا باعث شرم ہے۔ خود محنت کر کے اپنی دنیا بنانی چاہیئے۔ لذت محنت میں ہے:

پشیماں شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی
کجا عیش بروں آوردن لعلے کہ در سنگ است (۳۳)

درس خودی کا مقصد ہی یہ کہ انسان اپنی ذات کے لامحدود امکانات کو دریافت کرے کیونکہ خودی ہی وہ قطرہ ہے جو اوقیانوس کی وسعتوں کا حامل ہے۔ انسان آفاق میں گم ہونے والا نہیں، بلکہ آفاق اس میں گم ہونے والے ہیں۔ جس کا اپنا وجود حقیقت کی جلوہ گاہ ہو اور جس کا اپنا قلب خود عرش الہیٰ ہو وہ دوسروں کی تجلیات کا منت پذیر کیسے ہوسکتا ہے:

ز خاک خویش طلب آنچے کہ پیدا نیست
تجلیٔ دگرے در خود تقاضا نیست (۳۴)

خودی کے حوالے سے عصر حاضر میں اقبال نے سب سے زیادہ خود جوئی اور خود یابی کی تعلیم دی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی ہی سب سے بڑا دریائے راز ہے۔ اس میں غواصی کرنی چاہیئے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن (۳۵)

۳۔ زندہ رود کی تیسری اہم صفت یہ ہے کہ اس کا تمام پانی دوسروں کی زندگی کے کام آتا ہے۔ یہ مضمون بھی کلام اقبال کے ایک وسیع حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایثار اور دوسروں کی خدمت کا نام ہے، اور اچھا انسان وہی ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے (۳۶)

فکر اقبال کے دو بنیادی رکن ہیں۔ ایک خودی اور دوسرا بیخودی۔ بیخودی کا مرکزی مفہوم یہ ہے کہ جب انسانی خودی صفات الہیٰ سے متصف ہو کر اعلیٰ صلاحیتوں اور استعدادوں کی حامل ہوجائے تو وہ اپنی ان صلاحیتوں کو معاشرے کی خدمت میں صرف کرے۔ کوئی انسان اتنا ہی عظیم ہوگا جتنا وہ اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کو دوسروں پر نثار کرے گا۔ اس طرح بلندی رتبہ کا معیار خدمت خلق ہے اور یہی بڑے انسانوں یعنی انبیاء اور اولیاء کا شیوہ رہا ہے۔ خود علامہ اقبال نے اپنی تمام زندگی ملت اسلامیہ کی اصلاح احوال کے لئے صرف کردی۔ چنانچہ اسرار

خودی سے لے کر ارمغان حجاز کی تصنیف یعنی زندگی کے آخری لمحات تک وہ ملی مسائل کے حل کے لئے بیتاب اور مضطرب رہے اور ان کے حل کے لئے عملاً کوشاں رہے۔ فرماتے ہیں:

بیا تا کار این امت بسازیم
قمار زندگی مردانہ بازیم (۳۷)

سر راس مسعود کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن حکیم کے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت و طاقت مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تا کہ قیامت کے دن آپ کے جد امجد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجالا سکا۔" (۳۸)

اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو "بانگ درا" سے بیدار کیا اور "ضرب کلیم" سے ان طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کیا جو مسلمانوں کے وجود کو نابود کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ وہ دین و وطن کے خوفناک معرکے میں زندگی بھر تن تنہا لڑتے رہے:

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے (۳۹)

یہ وہ زمانہ تھا جب بڑے بڑے علماء دین و وطن کی اصطلاحات کے معنی تک نہیں سمجھتے تھے اور اسی بنا پر وہ غیر مسلم طاقتوں کا ساتھ دینے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اقبال نے اپنے غیر معمولی ولولہ انگیز کلام سے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کو نہایت خطرے میں دیکھ کر ان کے لئے ایک علیحدہ اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا۔ پھر اس تصور کو تاریخی شواہد کی روشنی صحیح ثابت کر کے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے دم واپسیں تک مسلسل کوشش کی یہاں تک کہ قرار داد پاکستان کے اعلان کے بعد قائد اعظم نے فرمایا کہ ہم نے وہ کچھ کر دیا ہے جس کا اقبال نے ہم سے مطالبہ کیا تھا (۴۰)

انہوں نے اپنے تمام حیات آفریں پیغام کو نہایت موثر اور دلنشیں شعروں کی صورت میں پیش کیا، ایسے اشعار کی صورت میں جن کا ایک ایک مصرع ان کا قطرہ خون تھا:

برگ گل رنگیں ز مضمون من است

مصرع من قطرۂ من است[۴۱]

اس طرح اقبال نے اپنی زندگی کے شب و روز ملت اسلامیہ کی خدمت میں صرف کئے۔ وہ اپنے فکرو نظر اور عمل کے نذرانے کبھی بحضور ملت اور کبھی بحضور عالم انسانی پیش کرتے رہے۔

۴۔ زندہ رود کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو کسی سمندر یا دوسرے دریا کی نذر نہیں کرتا، بلکہ خشک صحراؤں کو سیراب کرتا ہوا زمین میں جذب ہوجاتا ہے۔

یہ فکر اقبال کا وہ نکتہ ہے جسے ان کے تمام کلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی خودی کی حفاظت تاکہ وہ کسی دوسری خودی میں جذب نہ ہوجائے۔ اقبال کے نزدیک وہ چھوٹی سی ندی جو اپنی ذات کی حفاظت کی خاطر زمین میں چھپ جاتی ہے لیکن اپنی ہستی کو کسی سمندر کی نذر نہیں کرتی، نہایت مستحسن ہے۔ زندہ رود کی یہی بہترین تفسیر و تعبیر ہے:

اے خنک جوئے تنک مایہ کہ از ذوق خودی

در دل خاکم فرو رفت و بہ دریا نرسید[۴۲]

اقبال کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ انسان بحیثیت فرد یا بحیثیت قوم اپنا تشخص قائم رکھے۔ یہی اس کی زندگی ہے۔ اگر اپنی خودی کا تشخص کسی دوسری خودی جذب ہونے سے برقرار نہ رہے تو یہ خودی کی موت ہے۔ اقبال نے وحدت الوجود کے نظریہ کی مخالفت اسی وجہ سے کی کہ اس کی رو سے سالک اپنی ہستی کا جداگانہ تشخص ختم کردیتا ہے اور وہ خدا کی ذات میں اپنے آپ کو جذب تصور کرتا ہے اور یہی اس کا منتہائے کمال ہے، یعنی عشرت قطرہ ہے دریا فنا ہوجانا، اقبال ہر لحاظ سے اپنی مستقل حیثیت اور انفرادیت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی نظم "شبنم" میں کہتے ہیں کہ مجھے بطور قطرہ شبنم کہا گیا کہ میں فضا کی بلندیوں سے نیچے اتر کر سمندر میں جذب ہوجاؤں لیکن میں نے سمندر کی ہم آغوشی پسند نہ کی۔ میں نے وہ شراب نہ پی جو مجھے بے خود کردے۔ میں نے آفاق سے قطع نظر کیا اور برگ لالہ پر گر کر اسے قوت اور زندگی عطا کی یعنی معاشرے کی خدمت کی۔

گفتند فرود آے زاوج مہ و پرویز بر خود زن و با بحر آشوب بیامیز

باموج بر آویز، نقش دگر انگیز، تابندہ گہر خیز

من عیش ہم آغوشی دریا نخریدم آن بادہ کہ از خویش رباید نچشیدم

از خود نرمیدم، ز آفاق بریدم، بر لالہ چکیدم[۴۳]

وہ تصوف میں مسئلہ فنا کو بقا کا رنگ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "انسان جسمانی وروحانی اعتبار سے ایک قائم بالذات مرکز ہے لیکن وہ ابھی تک مکمل فرد نہیں ہوا ہے۔ وہ خدا سے جتنا دور ہوجاتا ہے اتنی ہی اس کی انفرادیت کم ہوتی جاتی ہے۔ جو خدا سے قریب ترین نقطہ پر پہنچ جاتا ہے وہی مکمل ترین شخص ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بالاخر خدا میں جذب ہوجاتا ہے، بلکہ اس کے برعکس وہ خدا کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے (حضرت مولانا روم نے اس مسئلہ کو بہت خوبصورتی سے سمجھایا ہے[۴۴])

وحدت الوجود کے نظریہ نے جب انسان کی انفرادی حیثیت ہی کو ختم کردیا تو جد وجہد کا نظام خود بخود معطل ہوگیا۔ اقبال اس کے منفی اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں: "ہندو حکماء نے وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا، یعنی انہوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کردیا۔"[۴۵]

اقبال کے نزدیک انفرادی حیثیت کو ختم کرنا تباہی بغداد سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور اس طرح ان کی تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک طرح کی بغاوت ہیں۔[۴۶] وہ ہر صورت میں انفرادی ہستی کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ اس طرح انسان عمل، پیکار اور جہاد میں مسلسل معروف رہے۔ کم از کم وہ بقائے وجود کے لئے مو کوشش رہے۔ مقدمہ اسرار خود میں لکھتے ہیں: "میری رائے میں انسان کا مذہبی اور اخلاقی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹادے یا اپنی خودی کو فنا کردے بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادی ہستی قائم رکھے۔"[۴۷]

اقبال اپنے خطبہ بعنوان: "اسلامی ثقافت کی روح" کے آغاز میں لکھتے ہیں "ایک بہت بڑے صوفی عبد القدوس گنگوہی کا قول ہے کہ: محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عرش معلیٰ پر گئے اور واپس آگئے۔ خدا کی قسم اگر میں وہاں گیا ہوتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔"[۴۸] یعنی نبی علیہ السلام نے کمال وصال میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا، جبکہ صوفی ایسا کرنا نہیں چاہتا اور وہ اپنے آپ کو ذات خداوندی میں جذب کردینا چاہتا ہے حالانکہ ایسا کرنے سے وہ کشمکش، پیکار، تصادم اور جہاد کی لذت سے بالکل محروم ہوجاتا ہے جو اصل حیات ہے۔

اقبال نے جاوید نامہ میں یہی کیفیت اس وقت بیان کی ہے جب حوریں زندہ رود کو بہشت میں ٹھہرنے کی درخواست کرتی ہیں لیکن اقبال وہاں نہیں ٹھہرتے اور واپس آجاتے ہیں:

بر لب شاں زندہ رود اے زندہ رود　　زندہ رود اے صاحب سوز و سرود

شور و غوغا از یسار و از یمیں　　یک دودم باما نشیں، باما نشیں [49]

اس پر زندہ رود کا جواب ہے کہ وہ مسافر جو سفر کے اسرار جانتا ہے وہ منزل کو رہزن سے بھی زیادہ خطرناک سمجھتا ہے:

راہرو کو داند اسرار سفر ترسد از منزل ز رہزن بیشتر [50]

اس طرح اقبال عالم وصال کو ترک کرکے عالم فراق کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں جہاں حرکت ہے، کوشش ہے اور پیکار ہے، اور یہی زندہ رود کا تشخص ہے۔

مندرجہ بالا توضیحات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ "زندہ رود" کی چاروں صفات علامہ اقبال کے افکار میں نمایاں صورت میں پائی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے مذکورہ دریا کی ان تمام صفات و خصوصیات کو اپنی فکری شخصیت میں بدرجۂ اتم محسوس کیا اور اپنا معنوی نام اس کے نام پر "زندہ رود" رکھا۔ اس طرح یہ نام ان کی فکری شناخت کے لئے موزوں ترین نام ہے، یوں بھی کہ اسے ان کے مرشد معنوی مولانا رومیؒ نے ان کے لئے تجویز کیا۔

# حواشی

۱- جاوید نامہ۔ لاہور ۱۹۵۹ء، ص ۶ ۲- جاوید نامہ کلیات اقبال (فارسی) لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۶۱ ۳- ایضاً ص ۶۲

4- The Divine Comeby dy Dante Alighieri New York. 1950

5- Islm and Divine Cqmedy by Miguel Asin. Lahore 1977

۶- دیکھئے اردا ویراف نامہ۔ ترجمہ رشید یاسمی از متن پہلو تہران صفحہ ۴ نیز دیکھئے اردا ویراف نامہ منظوم، زرتشت بہرام پژدو مشہد ۱۳۴۳ ص بیست۔

۷- محمد پادشاہ، فرہنگ انند راج، تہران ۱۳۳۶ خورشیدی۔

۸- محمد حسن خان، مرات البلدان، جلد اول تہران ۱۳۶۷ ص ۱۰۱ ۹- محمد معین، فرہنگ معین، تہران ۲۵۳۶

۱۰- محمد معین، لغت نامہ دہخدا، تہران ۱۳۳۹۔ رک: زاینده رود۔ ۱۱- دیوان حافظ، تہران ۱۳۱۷ ص ۲۹۶

۱۲- محمد پادشاہ، فرہنگ آنند راج، تہران ۱۳۳۶ خورشید ۱۳- محمد معین، لغت نامہ دہخدا۔

۱۴- پیام مشرق لاہور ص ۲۳۲ ۱۵- ایضاً ص ۱۵۱

۱۶- ایضاً ص ۱۵۲ ۱۷- بال جبریل لاہور ۱۹۶۲ ص ۸

۱۸- ضرب کلیم لاہور ۱۹۶۳ ص ۷۱ ۱۹- ارمغان حجاز ص ۲۵۵

۲۰- قرآن کریم ۱۱:۷ ۲۱- قرآن کریم ۲۱:۳۰

۲۲- بانگ درا۔ لاہور ۱۹۵۷ ص ۹۶ ۲۳- بانگ درا لاہور ۱۹۵۷ ص ۵۵

۲۴- ضرب کلیم لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۵ ۲۵- بال جبریل ص ۱۶۷

۲۶- زبور عجم کلیات مولانا اقبال، تہران ۱۳۴۳ ص ۱۱۶ ۲۷- جاوید نامہ ص ۱۸۲

۲۸- ایضاً ص ۱۸۴ ۲۹- بانگ درا لاہور ۱۹۵۷ء، ص ۲۹۳

۳۰- پیام مشرق ص ۶۲ ۳۱- رک: سیرت اقبال، محمد طاہر فاورقی لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۳۲۷

۳۲- مثنوی معنوی، بہ تصحیح نکلسن، دفتر پنجم شعر شمارہ ۲۵۰۲ ۳۳- زبور عجم، کلیات مولانا اقبال لاہوری، تہران ص ۱۵۵

۳۴- جاوید نامہ ص ۱۳۵ ۳۵- بال جبریل ص ۴۸؛

۳۶- بانگ درا ص ۲۱ ۳۷- ارمغان حجاز ص ۱۸۵

۳۸- رک: سیرت اقبال ص ۱۳۲ ۳۹- بال جبریل ص ۹۳

40- Hector Bolitho. Jinnah the Creator of Pakistan. P 128-129

۴۱- اسرار خودی۔ کلیات مولانا اقبال تہران۔ ص ۱۰ ۴۲- زبور عجم، کلیات مولانا اقبال ص ۱۴۴

۴۳- پیام مشرق کلیات ص ۱۱۹ ۴۴- رک: سیرت اقبال ص ۳۲۶

۴۵- خط بنام نکلسن رک: سیرت اقبال ص ۳۱۸ ۴۶- رک: اقبال نامہ جلد اول ص ۲۰۳

۴۷- رک: مقالات اقبال لاہور۔ ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۲

48- The Reconstruction of Religious Thought in Islam. Lahore, 1962 P 124

۴۹- جاوید نامہ کلیات مولانا اقبال، تہران ص ۳۷۵ ۵۰- ایضاً ص ۳۷۵